Fikr-o-Nasar (Islamabad) 6:1 (1968)

انتقاد

'فیوضاتِ حسینی المعروف تحفۂ ابراھیمیہ'

مولانا حسین علی صاحب مرحوم و مغفور، جن کا رجب ۱۳۶۳ھ میں انتقال ہوا، "دعوتِ توحید" کے سلسلے میں اپنے ایک مخصوص مسلک کی وجہ سے علماء اور عام مذہبی طبقوں میں بڑے مشہور تھے۔ مولانا مرحوم اپنے تلامذہ اور مریدوں کا ایک کافی با اثر طبقہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں، جو اُن کے مسلک پر عامل اور اُن کے طریقے پر "دعوتِ توحید" دینے میں سرگرمِ کار ہے۔ مولانا حسین علی صاحبؒ درسِ قرآن اور وعظ و تبلیغ میں توحید کے جو ایک خاص تصور پر زور دیتے تھے، اُس سے بظاہر یہ تاثر ہوتا ہے کہ شاید مولانا مرحوم بھی نفسِ تصوّف اور طریقت کے خانوادوں کے قائل نہ تھے اور صوفیہ کرام نے سلوک کے جو آداب و اشغال تجویز کئے ہیں، روحانی تربیت کے لئے اُنہیں ضروری نہ سمجھتے تھے، جیسا کہ بالعموم ہمارے ہاں "توحید" کی دعوت دینے والی بعض جماعتیں سمجھتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے مولانا مرحوم کے رسالہ تحفۂ ابراھیمیہ کی اشاعت کا منجلہ اور مقاصد کے، ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس امر کا اثبات کیا جائے کہ جہاں مولانا مرحوم اپنی مخصوص دعوتِ توحید کے علم بردار تھے، وہاں وہ ایک صوفی اور صاحبِ طریقہ بزرگ بھی تھے۔ اور روحانی تربیت کے لئے سلوک کی ضرورت و اہمیت کے معتقد تھے۔

اصل رسالہ فارسی میں ہے۔ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے مہتمم مولانا عبدالحمید صاحب سواتی نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اور شروع میں ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے متن، اس کا اُردو ترجمہ اور مقدمہ، یہ سب بڑے سائز کے ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہیں۔

رسالہ "تحفۂ ابراھیمیہ" کا آغاز "فضیلتِ ذکر" سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد صوفیہ کے مسلک کے مطابق "طریقِ ذکر" کا بیان ہے۔ صوفیہ کے نزدیک انسان کے اندر جو "لطائفِ خمسہ" ہیں، ذکر سے اُن کی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں، مصنف مرحوم فرماتے ہیں کہ "ان لطائف کا جو بھی نام ہو اور اُن کی جو بھی حقیقت ہو، تجربہ سے ہم نے

اتنا معلوم کیا ہے کہ ان مقامات میں اذکار کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ دعا کے لئے درود شریف لازم ہے، اُس کا اثبات کرنے کے بعد درود شریف کی برکات بیان کی گئی ہیں۔

مشائخ مرید کو اپنے شیخ کی شکل وصورت یاد کرنے کا فرماتے ہیں۔ مولانا مرحوم نے اس کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ سب سے بہتر اور مناسب طریقہ وہ ہے جو شاہ ولی اللہؒ نے بتایا ہے یعنی بزرگوں کا ذکر بطریق دعا اور درود کرتا ہے کہ یہ طریقہ شائبہ وہم شرک سے بھی دُور رہے۔ "توسل و استمداد" کا مسئلہ بڑا مابہ نزاع ہے۔ اس بارے میں مصنف فرماتے ہیں: "شریعت میں معروف یہ ہے کہ توسل دُعا کے قبول ہونے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپؐ کی آل پر درود پڑھنے سے ہوتا ہے اور اُن اہلِ ایمان کے لئے استغفار کرنے سے جو دنیا سے باایمان چلے گئے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اُنہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض مشائخ کرام اپنے پیر و مرشد کو مثل عینک کے خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کا فیض اس کے واسطہ سے اس طرح صاف اور نکھر کر ظاہر ہوتا ہے، جیسا کہ عینک میں چیزیں صاف نظر آتی ہیں۔

تصوف میں وجود کا مسئلہ سب سے اہم سمجھا جاتا ہے، مولانا حسین علی صاحبؒ نے زیرِ نظر رسالہ میں اس پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے بہت سے بزرگوں کے اقوال نقل کئے ہیں۔ مصنف لکھتے ہیں کہ صوفیہ کے احوال عالمِ سُکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب بعض لوگ ان کو ظاہری معنی پر محمول کرتے ہیں۔ اور اُن پر اعتقاد رکھتے ہیں اور بعض ایسا کہنے والوں کی تکفیر کرتے ہیں، یہ دونوں غلطی کرتے ہیں۔ خود مولانا مرحوم نے اپنا مسلک یہ بتایا ہے کہ ذات اور صفاتِ الٰہی میں جو چیز آیات و احادیث سے ثابت ہے، یا عقل کے ادراک کے مطابق محقق ہے، اس کے سوائے کوئی بات نہ کی جائے ...... اور جو کچھ اولیاء کرام سے ثابت ہے، یا اُنہوں نے جو گفت گو کی ہے، اُن کی مراد وہ نہیں، جو ظاہری طور پر سمجھی جاتی ہے، بلکہ اس کا مطلب کچھ اور ہے۔

رسالے کے آخر میں صوفیہ کے عام طریقے کے مطابق مصنف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر خود تک آٹھ خانوادہائے طریقت کا شجرہ دیا ہے۔ کیونکہ مرحوم بقول مترجم اگرچہ نقشبندی طریقہ سلوک کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اسی طریق میں زیادہ تر آپ بیعت فرماتے تھے، لیکن آپ کو تمام معروف طرقِ تصوّف و سلوک میں اجازت اور مناسبت تھی۔

رسالہ کے فارسی متن کا اُردو ترجمہ بڑا صاف اور رواں ہے، لیکن مترجم کی اصل چیز اُن کا طویل مقدمہ

ہے جس میں اُنھوں نے مولانا مرحوم کے مختصر حالاتِ زندگی بیان کرنے کے بعد مولانا کے شاگردوں اور مریدوں کا ذکر کیا ہے، اور جہاں ضرورت سمجھی ہے، اُن پر تنقید بھی کی ہے "مسئلہ حیات النبیؐ" پر پچھلے دنوں مولانا مرحوم کے بعض منتسبین کا بعض دیوبندی علماء سے جو شدید قسم کا نزاع ہوا مترجم نے اس پر بڑی سخت گرفت کرتے ہوئے لکھا ہے "بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اس کو اس قدر ایمان اور کفر کا مدار بنا کر سٹیج پر پیش کیا گیا اور جماعت کے عظیم کام میں رخنہ اندازی کی گئی"۔

مترجم نے ایک دو جگہ خود مولانا مرحوم کے بعض نتائج بحث سے اختلاف کیا ہے، اور لکھا ہے کہ اس معاملے میں مولانا کا قول مرجوح ہے، اور راجح قول اس کے خلاف ہے۔ ایک جگہ تو مترجم نے بڑے اچھے انداز میں، لیکن بالواسطہ مولانا مرحوم کی شدت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ مولانا حسین علی صاحبؒ اور مولانا احمد خان صاحبؒ ایک ہی مرشد کے مرید تھے۔ آخر الذکر کو مولانا حسین علیؒ کا بعض مسائل کے اظہار میں شدت کا جو رویہ تھا، وہ ناگوار تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے حضرت مولانا انور شاہ صاحب میانوالی تشریف لائے۔ مولانا حسین علیؒ نے حضرت شاہ صاحب سے مولانا احمد خان کی شکایت کی کہ یہ میرا پیر بھائی ہے۔ اور مسئلہ میں بھی میرے ساتھ متفق ہے، مگر یہ بات صاف اور سخت نہیں کرتا۔ حالانکہ اللہ فرماتا ہے "واغلظ علیھم"۔ مولانا احمد خان نے فرمایا کہ مولانا! وہ جہاد کا مقام ہے۔ تبلیغ کے مقام پر "فقولا لہ قولاً لینا" آیا ہے۔ اس کے بعد مولانا انور شاہ صاحب نے فرمایا:۔

> "بہت خوب۔ پھر مولانا حسین علی صاحبؒ سے فرمایا کہ مولانا آپ کی شدت نے آپ کے مخالفین کی جماعت کو بڑا کر دیا ہے"۔

مترجم نے یہی شکایت مولانا مرحوم کے بعض شاگردوں کے متعلق بھی کی ہے۔ مولانا غلام اللہ خان کے بارے میں لکھا ہے:۔ "مزاج میں شدت بھی بہت ہے اور کچھ مخالفین کی ناجائز باتوں سے شدت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے"۔ مولانا مرحوم کے ایک اور شاگرد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "بعض مسائل میں آپ کی تحقیقات اور طرزِ روش فی الجملہ تشدد پسندانہ ہے جس کی وجہ سے تلامذہ کے اذہان پر تیزی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر حدودِ اعتدال کو قائم نہیں رکھ سکتے اور ابتلا و تشتت کا باعث بن جاتے ہیں۔ کاش اگر یہ لوگ اکابر کی روش کو ترک نہ کرتے تو کیا اچھا ہوتا"۔

مقدمہ میں مولانا مرحوم کے رسالے کے مباحث کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ اور اس سلسلے میں بہت سے بزرگوں کے اقوال بطورِ استشہاد پیش کیے گئے ہیں۔ چناں چہ اس طرح زیرِ نظر کتاب محض مولانا حسین علیؒ کے رسالے کا ترجمہ نہ رہا۔ بلکہ موضوعات زیرِ بحث پر ایک مستقل کتاب بن گئی ہے۔ خاص کر مترجم نے تصورِ شیخ، شیخ سے تعلق رکھنے اور وحدت الوجود کے مسئلے پر بڑی مفید، عالمانہ اور مبنی بر اعتدال بحث کی ہے۔

اب ہم زیرِ نظر رسالے کے مشمولات کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس رسالے میں ذکر، تصورِ شیخ، شیخ کو وسیلہ بنانے، تمام بدن میں ذکر کے جاری ہونے اور اس طرح کے دوسرے اشغالِ تصوّف کا جو بیان ہے، ان سے واقعی افراد کی روحانی تربیت ہوتی تھی اور تاریخ کے اُس دَور میں جب مسلمانوں کا معاشرہ انتہائی پراگندگی و خلفشار کا شکار ہوگیا تھا اور کوئی ایسا سیاسی و اجتماعی نظام نہ رہا تھا، جو بے سہارا لوگوں کو باطنی سکون اور دنیوی امن عطا کرتا، تصوف اور اُس کے طریقوں نے افراد کو اپنی روحانی پناہ میں لیا، اُنہیں باطنی سکون بھی دیا اور خانقاہی نظام کے ذریعہ ایک حد تک دنیوی امن اور سہارا بھی بہم پہنچایا۔ ہمارے نزدیک تصوف کے یہ طریقے اور اُس کا خانقاہی نظام ہماری تاریخ کے اس طویل دَور میں ایک نعمت تھا۔ مسلمانوں کا زوال در اصل ان کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ یہ مسلمانوں کے زوال میں اُن کا سہارا بنے۔

مترجم نے مقدمہ میں "تصورِ شیخ" کے ضمن میں اس مسئلے پر بڑی اچھی بحث کی ہے۔ اور بعض بزرگوں کے حوالے دے کر بتایا ہے کہ اس کو اصل میں حضوری اور دلجمعی کا واسطہ بتایا گیا ہے۔ اگر اس سے عوام کے عقیدہ میں خرابی پیدا ہونے کا شبہ ہو، تو اُسے ترک کرنا بہتر ہے۔ اس بارے میں مترجم نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کے دو اقتباسات دیئے ہیں، جو خاص طور سے قابلِ توجہ ہیں۔ ایک میں مولانا نے ایک صاحب کو جواب میں لکھا ہے کہ "تصورِ شیخ قبائح سے خالی نہیں، اس لئے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔" اور دوسرا اقتباس یہ ہے۔ دوسرے شخص کو لکھتے ہیں:۔

"خلاصہ یہ ہے کہ خطرات کے دُور کرنے اور خیالات کو جمع کرنے اور ہمت کو قوی بنانے کی عبادات میں جس قدر اہمیت ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں ہے اور چونکہ تصورِ شیخ کی تاثیر اس امر میں انتہائی درجہ پر مفید ہے...... اس لئے تجربہ اور نصوص نے اکابرِ امت کو اِس

طریقہ کے جاری کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ اُمت کو اس سے بے شمار فوائد حاصل ہوئے جیسا کہ مولانا عبدالرحمن جامیؒ کے ارشاد سے ظاہر ہے۔ مگر چونکہ متاخرین غلط کاروں نے اس میں محظورات اور ناجائز اشیاء داخل کر دیں .... اس لئے سمجھدار اکابرین پر لازم ہو گیا کہ اس پر فکر فرمائیں اور ذریعہ شرک و کفر کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیں۔"

لیکن اس کے باوجود شرعی حیثیت سے مولانا مدنیؒ کی یہ رائے ہے:-

> "بہر حال یہ امر مطلقاً ممنوع ہے نہ مطلقاً ضروری ہے۔ فتویٰ دینے اور عمل کرنے میں غور و فکر اور سوچ سمجھ سے کام لینا چاہیئے۔"

اس سلسلے میں ہمارا سوال یہ ہے کہ جب وہ معاشرہ نہیں رہا جس میں کہ خانقاہی نظام کی واقعی ضرورت تھی۔ اور اب افراد کی باطنی تربیت کے دوسرے ذرائع موجود بھی ہیں، جن میں ایک اپنے وسیع معنوں میں رفاہِ عامہ کے کام ہیں۔ تو کیا اس وقت اس کی ضرورت نہیں کہ افراد کی توجہ ان اشغال سے ہٹائی جائے اور اُنہیں بتایا جائے کہ وہ اپنے گرد و پیش بسنے والے لوگوں، اپنی قوم اور بنی نوع انسان کی خدمت کر کے اپنی باطنی تربیت کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد دوسرا مسئلہ وحدت الوجود کا ہے، جس پر اصل رسالے میں بھی بحث کی گئی ہے، اور مترجم نے اپنی طرف سے بھی اس پر کافی اضافہ کیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس مسئلے کی علمی حیثیت تو اپنی جگہ ہے ہی، لیکن ایک اس کی عملی اور افادی حیثیت بھی تھی۔ وحدت الوجود کے قائل جب یہ کہتے ہیں —— کُل کائنات کا ذاتِ الٰہی سے صدور ہوا ہے، اور یہ کہ "حق جس طرح اللہ تعالیٰ کے بعض مظاہر سے ہے، اسی طرح باطل بھی اس کے بعض مظاہر سے ہے۔" اور پھر شیخ ابو مدین کا یہ قول "باطن کو اوپرا مت سمجھو اس کے طور میں، یعنی عیب کی طرف مت منسوب کرو کیونکہ وہ بھی اس کے ظہورِ باکرشمہ ہے اس لئے کہ وجود ہر شے کا اس کے وجود کا پرتو ہے۔ اس لئے اپنے حوصلے کے مطابق اس کا حق ادا کرو تاکہ تم بھی مرتبۂ کمال تک پہنچ سکو اور وہ مرتبہ وحدت الوجود ہے۔ یعنی ہر چیز کے وجود میں وجودِ حق دکھائی دے۔" ص۷۹۔ تو عملاً اُس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ وجود کی وحدت کے تصور سے ذہن میں انسانیت کی وحدت کا احساس اُبھرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ حق کسی خاص جماعت، گروہ، فرقے یا قوم میں محصور ہو کر نہیں رہ جاتا کہ اُسے تو حق کلّی کا مظہر مانا جائے اور باقی سب کو مردود و لعنتی سمجھ لیا جائے، جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں عام ہے۔ وحدت وجود کا تصور

انسانی ذہن کے دریچے کھول دیتا ہے کہ جہاں بھی حق کی ہوا چل رہی ہو، وہ اُس تک پہنچ سکتی ہے۔

بدقسمتی سے ہم نے وحدت وجود کو ایک ریاضی کا سوال بنالیا ہے اور اُسے اُس کے عملی و افادی پہلوؤں سے الگ کرکے دیکھتے اور حل کرتے ہیں۔

اب آخر میں توحید کا مسئلہ لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید نے توحید پر بہت زور دیا ہے۔ اور آج مشرکانہ رسوم کا سدِّباب بھی بہت ضروری ہے، لیکن عقیدۂ توحید کے کچھ عملی متضمنات بھی ہیں۔ بدقسمتی سے مولانا حسین علی صاحبؒ اور اُن کے منتسبین نے توحید کے عملی متضمنات کو تو زیادہ قابلِ توجہ نہ سمجھا، اور وہ اس کی نظری نوعیت پر اتنا زور دینے لگے کہ ان میں شدت پیدا ہوگئی۔ ایک عقیدہ خواہ وہ کتنا ہی برتر و بلند کیوں نہ ہو، آخر ایک مخصوص زمان و مکان میں اُس کا ذہنی مفہوم متعین ہوتا ہے۔ اب اگر یہ عقیدہ اور اُس کا متعین ذہنی مفہوم اِس مخصوص زمان و مکان میں خیر و صالحیت بروئے کار لانے کا باعث نہیں بنتا، تو اس کی برتری و بلندی کو کون مانے گا۔

قرآن کی توحید نے دنیائے انسانیت کو ایک عالم گیر اور جامع جمیع جہات نظام دیا تھا۔ ہمارے یہ بزرگ اپنے توحید کے اس تصور سے جو وہ قرآن سے اخذ کرتے ہیں، کون سا نظام بروئے کار لانے کا عزم رکھتے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے، اور ہمارے نزدیک اسی سے کلیتہً اعراض برتا گیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب "فیوضاتِ حسینی المعروف تحفۂ ابراہیمیہ" بڑے اہتمام سے چھاپی گئی ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت نہایت عمدہ ہے، کتاب مجلد ہے اور دیدہ زیب ہے، قیمت پانچ روپے ہے۔ ناشر ادارۂ نشر و اشاعت مدرسۂ نصرۃ العلوم، گوجراں والہ۔

(م۔ س)

طابع۔ ظہیر الدین   مطبع۔ استقلال پریس۔ لاہور
ناشر۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن۔ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی۔ اسلام آباد (پاکستان)